اُردو ناول میں لاہور کی تہذیب وثقافت

ڈاکٹر ریحانہ کوثر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور
زاہدہ بشیر
ایسوسی ایٹ پروفیسر
گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین، لاہور
رابعہ بی بی ریسرچ سکالر
شعبہ اردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

Abstract:

There are no two opinions about the cultural importance of Lahore as a part of civilization of this part of subcontinent. There is also no gainsaying the fact that the Urdu novels have played a vital role, if not the pivotal role in sponsoring nearly all dimensions of Lahorite Culture enveloped by the civilization of different era in broader perspective. Be it the novels of Mustanser Hussain Tarar or bold narration by Asim Butt. Be it the feminine version of Bano Qudsiya or the progressive articulation by Yunis Javed. Apart from it, rather surpassing the aforesaid, is the glimpses of Urdu novels on Lahore in the historic novels of Mustunser Hussain Tarar. All said and done, it is above board and without a grain of salt that Urdu novels splendidly expresses the culture and civilization of Lahore in different periods of time.

Keywords: Urdu novel, Lahore Culture, Civilization, Lahore, Subcontinent.

اُردو کے نثری ادب میں ناول ایک نثری قصے کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں واقعات کا تاثر حقیقی زندگی سے جڑتا نظر آتا ہے۔ صنف ادب میں ناول کی تعریف زندگی کے حقائق بیان کرنے والی صنف کے طور پر کی جاتی ہے۔ ناول اطالوی زبان کے لفظ ناولا (Novella) سے نکلا ہے۔ ناولا نئے کو کہتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ناول کے معانی نادر اور نئی بات کے

ہیں۔ اس تاریخی حقیقت سے انکار پیش کیا جا سکتا کہ ناول انسان کی ماورائی کہانی کے مزاج سے اکتاہٹ کے باعث وجود میں آیا کیونکہ ناول کی کہانی اس کی حقیقی اور جیتی جاگتی زندگی سے جڑی تھی۔ اسی لیے انسان نے اسے "نیا" یا ناولا کے نام سے پکارا۔ اصطلاحی اعتبار سے ناول ایک ایسی نثری اور حقیقی کہانی کو کہا جاتا ہے جو عملی زندگی کی مکمل تصویر ہو اور جس میں کسی مخصوص دور کی حقیقی انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو تفصیل سے مربوط انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ ناول نگاری کے فن کو موجودہ مقام تک پہنچنے میں کئی ارتقائی منازل طے کرنا پڑیں جن سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ مختلف ادوار میں مختلف زبانوں کے ادیبوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق ناول کو جانچا اور پرکھا اور پھر اپنے خیالات کا اظہار کر کے ناول کی تعریف کی۔ ان تمام تعریفوں اور اس کے فنی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اطالوی زبان سے تعلق رکھنے والا یہ لفظ چودھویں صدی میں لوگوں کے سامنے آیا۔ اس کی اصل Storia Novella سمجھی جاتی ہے۔ جس کا اصطلاحی مفہوم تازہ کہانی ہے لیکن بعد میں یہ مفہوم ناول کے لیے مخصوص ہو گیا۔ مختلف زبانوں کے مختلف ادیبوں نے ناول کی مختلف تعریفیں کیں۔ رالف فاکس ناول کی تعریف کچھ اس طرح کرتا ہے۔

> "It is the great folk art of our civilization, the successor to the epic and the chanson de geste of our ancestors and it will continue to live."

یعنی ناول ہماری تہذیبی زندگی کی وہ کہانوی صنف ہے جو آج بھی وہی اہمیت رکھتی ہے جو کسی زمانے میں لوک کہانیوں کو دی جاتی تھی۔ انگلستان کی ایک ادیبہ کلارا ریوز نے ناول کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے کہ:

> "ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔"(۲)

مشرق میں دیکھیں تو مرزا ہادی رسوا ناول کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ناول نویس ان واقعات کو علی العموم تحریر کر دیتا ہے جو اس نے اس زمانے میں دیکھے ہیں یا اسے دوسری عبارت میں یوں کہیے کہ تصویریں ہیں کہ دل و دماغ کے مرقع میں موجود ہیں کہ انھیں کی نقل اتار اتار کر ناظرین کو دکھاتا ہے۔ کسی قصے کو دلچسپ بنانے کے لیے اصل حقیقت سے دُور ہو جانا ایسی غلطی ہے جس سے لکھنے والے کی قلعی کھل جاتی ہے۔"(۳)

گویا ناول نثر کی وہ قسم ہے جس کی کہانی عصری زندگی کی سماجی حسیت، تہذیب، ثقافت اور تمدنی شعور کو تسلسل اور روانی کے ساتھ فنی اور جمالیاتی طور پر قاری کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی قصہ گوئی، دلچسپی، واقعہ طرازی، کردار نگاری، ماحول، منظر نگاری، مکالمہ، پلاٹ اور اسلوب وغیرہ قرار پاتے ہیں۔ باقی تمام اجزاء کے علاوہ ماحول اور کردار دو ایسے اجزاء ہیں جنھیں ہر ناول کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ناول خواہ کسی بھی زبان میں لکھا جائے وہ اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کو بیان کرتا ہے۔ اور اس کے کردار حقیقی زندگی کے عکاس ہوتے ہیں جو خاندانی رسم و رواج، آداب گفتگو طرزِ زندگی غرض اپنے عہد کی پوری تہذیب اور ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تہذیب اگرچہ ایک پانچ حرفی لفظ ہے لیکن اس پانچ حرفی لفظ کے ساتھ مفہوم اور معنی کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس میں انسانی زندگی سے منسلک رسم و رواج، طرزِ حیات، فنونِ لطیفہ، سماجی رویے، آداب گفتگو، نشست و برخاست، فکر و افکار، مذہب و فلسفہ، معاشرت، انسانی رویے غرض ہر چیز جو معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے شامل ہے اور تہذیب کے ساتھ ثقافت بھی زندگی کا بنیادی جزو قرار پاتی ہے۔ کسی بھی تہذیب اور ثقافت کا اندازہ اُس ملک یا خطے میں بسنے والے لوگوں کی روایات، مذہب، زبان، خیالات، قانون اور رسم رواج سے لگایا جاتا ہے۔ ادیب کا لب و لہجہ تہذیب اور ثقافت کی نمائندگی کر کے ہی قاری کی توجہ حاصل کرتا ہے۔ ایک اچھا ادیب اُسی وقت اپنی تخلیق کو کامیاب کر سکتا ہے جب وہ اُس معاشرے کی تہذیب و ثقافت کو پورے طور پر سمجھ کر اُس کی عکاسی کرے۔ کسی بھی زبان کا ادبی سرمایہ اُس تہذیب و ثقافت کی پہچان ٹھہرتا ہے۔ اُردو زبان اور ادب میں یہ سرمایہ داستانوں اور ناولوں کی شکل میں موجود ہے۔ داستانوں کی تخیلاتی فضا سے نکل کر جب نثر ناول کی شکل میں انسانی معاشرے کی حقیقتوں کی ترجمان بنی تو ہر

عہد کے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں تہذیب و ثقافت کو بیان کیا۔ نذیر احمد ہوں یا رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا ہوں یا پھر پریم چند، ہر ادیب کے ہاں اُس کے عہد کی تہذیب و ثقافت کی ترجمانی نظر آتی ہے۔

معاشرتی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ ہر اچھے ادیب نے اپنی تخلیقات میں اپنے شہروں کی زندگی اور تہذیب کو بیان کیا ہے۔ یہ اُن کے شہر، گنبد اور مینار، در اور دروازے، قصے، گلی کوچے ہی تھے جن کے ذکر نے اُن کی تحریروں کو تابندگی بخشی۔ ڈکنز کا لندن ہو یا ٹیگور اور ستیاجیت رئے کا کلکتہ، نذیر احمد اور میر امن کا دہلی ہو یا صادقین کا امروہہ اسماعیل قادارے کا ترانہ ہو یا نجیب کا قاہرہ یا پھر پاموک کا استنبول۔ ان جانے مانے ادیبوں کی تحریریں، ان کے شہروں کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہیں۔ اسی طرح لاہور شہر جو اپنی مسجدوں، مندروں، باغوں، علمی اداروں، گنبدوں، میناروں، میلوں ٹھیلوں اور کھانوں کی رنگارنگ تہذیب و ثقافت سے معمور ہے۔ یہاں کے ادیبوں کی تحریروں میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ اے حمید، بانو قدسیہ اور مستنصر حسین تارڑ جیسے مہان ادیبوں نے اپنے ناولوں میں اس شہر کی تہذیب و ثقافت کے دل کش رنگوں کو سمو کر اس شہر کی قدیم عمارتوں، مندروں، مسجدوں، گلی کوچوں اور باغوں کو امر کر دیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ خود کہتے ہیں کہ:

> ”تو میں بھی ایک نولاہوریا، اس شہر کے عشق میں تخلیق کے روزے رکھ رہا ہوں جیسے گلزار، میناکماری کی یاد میں اب بھی روزے رکھتے ہیں۔“(۴)

یہ ایک ادیب کا اقرار ہے جو اپنے شہر کے عشق میں مبتلا ہے۔ اے حمید، بانو قدسیہ اور مستنصر حسین تارڑ کے علاوہ عبداللہ حسین، انور سجاد، یونس جاوید، محمد عاصم بٹ نے بھی شہر لاہور کی صدیوں پرانی تہذیب کی مہک میں بسی گلیوں کے کرداروں کو اپنے ناولوں میں سمویا ہے۔ لاہور اپنی تاریخ، ثقافت اور تہذیب کے ساتھ ایک شہر بے مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیبوں نے اپنے ناولوں میں شہر لاہور کی تہذیب اور ثقافت کو بیان کیا ہے۔ یہاں کے موسم اور رہن سہن کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی اپنے شہرۂ آفاق ناول ”کئی چاند تھے سرِ آسمان“ میں لکھتے ہیں کہ:

"لاہور کے چلچلاتے دِن، کہ جن کی تمازت سے گھبرا کر چیل انڈا چھوڑتی تھی اور گرگٹ کا جگر کباب ہو تا تھا، اور وہ سائیں سائیں کرتی راتیں جب بیکانیر سے دِن میں اٹھ کر جودھپور اور ملتان کو روندتی ہوئی، شجر حجر، ہر فرد بشر کی صورتوں کو گرد آلود کرتی ہوئی ہوائیں لاہور کے سنسان کوچہ وبازار میں ہلچل مچاتیں، بھلا بارش کے ایک دو چھینٹے تنور میں جلی ہوئی نان کی طرح خشک سیاہ کڑکڑاتی لاہوری زمین کا گلا کیا سیر اب کرتے۔ بوند پڑتی تو چھن سے یوں سوکھ جاتی جیسے سرخ توے پر دودھ کی چھینٹ۔ گرم ٹھہری ہوئی سناٹی راتوں میں لگتا تھا شہر میں اندر باہر کوئی نہیں چاہے کوئی پکارے۔"(۵)

لاہور کے موسم گرما کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول "راکھ" میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ:

"دوپہر لاہور کی تھی اور ویسی ہی تھی جیسی کہ لاہور کی گرمیوں میں دوپہریں ہوا کرتی ہیں۔ گرم تندور ہوا میں ٹھہری ہوئیں اور اس دوپہر میں مشاہد سکول سے لوٹا۔"(٦)

لاہور کے موسموں کی سختی اپنی جگہ مگر یہاں کے باشندوں میں مختلف عقیدوں کی موجودگی نے بھی یہاں کی تہذیب میں ایک رنگارنگی پیدا کی، جہاں بزرگوں کے عُرس اور میلے ٹھیلے لاہور کی تہذیب و ثقافت میں شامل تھے وہیں محرم الحرام میں شیعہ مسلک کے لوگوں کی روایات بھی لاہور کی تہذیب اور ثقافت کا ایک حصہ رہی ہیں۔ یہاں کے امام باڑے اور عزاخانے بھی لکھنو اور دہلی کی طرح پرانی روایات کے امین ہیں۔ ہندوستان میں عزاداری اور ثناء خوانی کے ساتھ تعزیہ داری کا زیادہ رواج مغلوں کے دور میں ہوا۔ جہانگیر کے عہد میں اس کی ملکہ نور جہاں نے اس عقیدے کو زیادہ رواج دیا اور ایرانی طرز کی عزاداری یہاں کی روایت بن گئی۔ اگرچہ لاہور میں عزاداری اور امام بارگاہوں کی کوئی مستند تاریخ نظر نہیں آتی جس سے معلوم ہو کہ یہاں اس کا آغاز کب ہوا۔ لیکن مغلوں کے دور میں شروع ہونے والی عزاداری لاہور کی روایت ، تہذیب اور ثقافت کا حصہ بن گئی۔ شمس الرحمن فاروقی اپنے ناول میں اس کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتے

ہیں:

> ”محرم کا چاند دکھائی دینے میں کچھ دن باقی تھے لیکن لاہور میں حضرت خلد منزل شاہ عالم بہادر شاہ اول ۔۔۔ کی ڈالی ہوئی رسم کے اتباع میں محرم کا اہتمام زیادہ ہونے لگا تھا ۔۔۔ سیاہ کپڑوں پٹکوں، دوپٹوں اور سیاہ مخمل کی جوتیوں کے ساتھ ساتھ پیش قبضوں اور خنجروں کے لیے سیاہ ڈابوں کی تلاش ہونے لگی۔ عزاخانوں کی صفائی تپائی ہونے لگی۔ بچے بوڑھے، جوان، عورت مرد بلالحاظ مذہب وملت مرثیوں اور نوحوں کی بیاض کو جھاڑ پونچھ کر تیار اور پہلے سے یاد کیے ہوئے رثائی کلام کو اپنے اپنے حافظوں میں تازہ کرنے لگے۔ ہیرامنڈی کے ارباب نشاط کے بالاخانوں سے بھی اب ماتمی دھنیں بلند ہونے لگیں۔“(۷)

لاہور میں امام باڑوں کی تعداد سو سے بھی کہیں زیادہ ہے لیکن سب سے قدیم امام باڑہ بیرون بھاٹی گیٹ امام باڑہ گامے شاہ ہے۔ ناول میں جہاں پلاٹ کی اہمیت ہے وہاں اس کے کردار بھی بے حد اہمیت کے حامل ہیں اور کرداروں کا تعلق چونکہ معاشرے سے ہوتا ہے اس لیے ناول میں معاشرے کے رہن سہن، رسم ورواج، لباس، عقائد سبھی کچھ بیان ہوتا ہے اور یہی اُس معاشرے کی تہذیب ہے۔ لاہور کی قدامت، تہذیب اور ثقافت نے ہمیشہ لکھنے والوں کو اسیر رکھا ہے۔ اس قدیم شہر نے کئی تہذیبوں کا عروج وزوال دیکھا۔ کئی مذاہب اور اور تہذیبیں آئیں مگر ہر نئے آنے والے مذہب اور تہذیب نے پرانے مذہب اور تہذیب کا چراغ گل کر کے اپنی شمع روشن کی۔ بُدھ مت آیا، کنشک آئے، جین مت آئے مگر اپنا وقت گذار کر تاریکی میں ڈوب گئے۔ لاہور نے کئی تہذیبوں کو دیکھا مگر ہر حملہ آور پرانی تہذیب کو مٹا کر اپنی تہذیب کو زندہ کرتا رہا۔

لاہور کو جدید دنیا سے روشناس کروانے کا سہرا انگریزوں کے سر ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور ہوئی تو سکھ طاقت پکڑ گئے۔ انھوں نے جی بھر کے لاہور شہر کو لوٹا، گھروں کو جلایا،

حویلیاں اور محل مسمار کیے، اینٹیں اور عمارتی سامان اکھاڑ کر لے گئے۔ مغلوں اور امراء کے خزانے تلاش کرتے ہوئے دیدہ زیب مکانوں کی چھتوں کو اکھاڑ پھینکا اور شہر کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ گلیاں، بازار اور کوچے کیچڑ اور دلدل سے بھر گئے۔ شہر میں شدید قحط پڑا۔ ۱۸۴۹ء میں جب انگریز لاہور آئے تو شہر میں صفائی کا نام ونشان نہ تھا۔ انگریزوں نے تمام گلیاں اور بازار صاف کروائے۔ شہر میں نئے فرش بچھے۔ انار کلی کے علاوہ میں دفاتر، نئی عمارتیں، بارکیں اور کوٹھیاں بھی بنیں۔ لاہور کا نقشہ بدل گیا اور شہر کی خوشنمائی اور خوبصورتی میں بے حد اضافہ ہوا۔ انگریز کے آنے سے برصغیر پاک وہند میں ریل کا نظام متعارف ہوا۔ لاہور میں انگریز کی بنوائی ریلوے اسٹیشن کی عظیم عمارت پورے برصغیر میں سب سے بڑی اور خوبصورت عمارت تھی۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول "خس وخاشاک زمانے" میں ریلوے اسٹیشن کو یوں بیان کیا ہے کہ اُس کی عظمت اور تہذیب لفظوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اُن جادوئی عمارتوں کے سائے سائے چلتا۔ فاصلے طے کرتی ریل گاڑی کی پٹڑی کے کنارے کنارے چلتا وہ ایک اور عجوبے کے سامنے تھا اور یہ لاہور کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ سٹیشن کیا تھا سنگلاخ چٹانوں کا ایک ڈھیر تھا جس میں سے برج اٹھ رہے تھے۔ فصلیں ابھر رہی تھیں۔ ایک حفاظتی قلعہ تھا جس کے بُرجوں میں سے توپیں بھی داغی جا سکتی تھیں۔ یہ انگریز سرکار کا کمال تھا۔ لاہور اسٹیشن کے برآمدے بھی ایسے تھے جیسے محلوں اور اونچی حویلیوں کے ہوتے ہیں اور وہاں ستونوں سے ٹیک لگائے سرخ رنگ کی پگڑیاں باندھے سامان ڈھونے والے قلی لوگ بیٹھے کلکتہ سے آنے والی ڈاک گاڑی کے مسافروں کی آمد کے منتظر تھے۔ ایک ہی بیڑی کے کش آپس میں بانٹتے وہ ہنسی مخول میں ایک دوسرے کو ایسی گالیاں دے رہے تھے جنھیں سُن کر اُسے پسینہ آگیا۔"(۸)

۱۸۸۴ء میں لاہور ریلوے اسٹیشن سے ٹرین کا آغاز ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں بننے والے اس اسٹیشن کا رعب اور دبدبہ آج بھی قائم ہے۔ کسی بھی شہر کی تہذیب وثقافت وہاں پر بسنے والے لوگوں کے رہن سہن

کھانے پینے کی عادات، عقائد، تہوار اور رسم و رواج کی عکاسی کرتی ہے۔ لاہوری معاشرے کی تہذیب و ثقافت کے بیشتر رنگ اردو ناول میں نظر آتے ہیں۔ ایک عرصے تک تانگے کی سواری لاہوری تہذیب کا حصہ رہی اور یہاں کے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کے لیے تانگے کی سواری استعمال کرتے رہے حتٰی کہ مال روڈ جیسی خوبصورت اور اہم شاہراہ پر بھی تانگہ چلا کرتا تھا لیکن پھر گذرتے وقت کے ساتھ شہر میں جہاں اور تبدیلیاں ہوئیں وہاں مال روڈ پر بھی خوشنمائی برقرار رکھنے کے لیے تانگے کی ممانعت کر دی گئی۔ لیکن جب کوئی پرانا لاہوریا اپنے وطن لوٹتا ہے تو وہ تانگے پر بیٹھ کر مال روڈ سے گذرنے کی تمنا کرتا ہے۔ جیسا کہ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول میں لکھا ہے:

> ”لاہور اسٹیشن سے باہر آ کر مصطفٰی اسلام کو توقع تھی کہ عین سامنے درجنوں بانکے لاہوری اور پشاوری ٹانگے منتظر ہونگے اور اُن کے گھوڑے ہنہنا کر اُن کا استقبال کریں گے لیکن وہاں صرف تین چار ایسے کہولت زدہ تانگے کھڑے تھے جن کے بوسیدہ پہیوں میں بھی لکڑی کے پیوند لگے تھے اور ان میں سے ایک کبڑا ہو چکا کوچوان۔۔۔ پان کی پیک پچکاری کرتا نہایت کاہلی سے اُن کی جانب آیا تو مصطفٰی نے پوچھا ”بھائی جان لوہاری۔۔۔“ تو اُس مردِ درویش نے جو ایک اونگھ میں تھا، ذرا جھول کر کہا۔۔۔ بھاٹی لوہاری کلی سواری۔۔۔“(۹)

یہ فقرہ لاہور کی پوری ایک تہذیب اور ثقافت کا ترجمان بن جاتا ہے کہ جب اسٹیشن پر آوازیں لگاتے بنے سنورے تانگوں کے کوچوان بے وجہ اپنے گھوڑوں کو چابک رسید کرتے اور مسافروں کو متوجہ کرتے ہوئے کہتے ”بھاٹی لوہاری کلی سواری“۔ لاہوری تہذیب و ثقافت میں تانگے کی سواری اس درجہ دخیل تھی کہ اس حوالے سے کئی فلمیں بنیں اور کئی گانے لکھے گئے جو مدتوں لاہور کی گلیوں میں گونجتے رہے۔ لاہور کے سینما گھروں کے باہر شو ٹوٹنے پر تانگوں کا ایک ہجوم ہوتا جو مختلف علاقوں کی سواریاں لے جانے کے لیے آوازیں لگا رہے ہوتے اور ”کرشن نگر“، ”سنت نگر“، ”دِلی دروازے“، ”موچی دروازے“، ”مغل پورہ“، ”گڑھی شاہو“ کی آوازیں پورے لاہور کے علاقوں کا تعارف بن جاتیں۔ تانگے کی سواری نہ

صرف عام عوام کی سواری تھی بلکہ شہر کے رئیس اور امراء بھی اس سواری کا شان سے استعمال کرتے۔ جیسا کہ اے۔ حمید نے اپنے ناول میں لکھا ہے:

> "وحید اپنے لیے بھی نئے کپڑے لایا تھا اور ماں کے لیے بھی۔ انھوں نے نئے کپڑے پہنے اور تانگے میں سوار ہو کر مال روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مال روڈ کے ایک اعلیٰ ہوٹل میں بیٹھ کر انھوں نے چائے پی۔"(۱۰)

انگریز کے آنے سے اگر چہ لاہور ایک نئی تہذیب سے آشنا ہوا لیکن پرانی تہذیب جو چار دیواری کے اندر محدود تھی اور جہاں مسلمان، سکھ اور ہندو مذہب کو ماننے والے رہتے تھے اُردو ناول میں بیان ہوتی رہی ہے۔ صدیوں تک اکٹھا رہنے کے باعث ان تینوں مذاہب کے ماننے والوں کے رسم و رواج آپس میں مل جل گئے اور یوں ایک شہر لاہور کی لاہوری تہذیب سامنے آئی۔ عید، شبرات، دیوالی، دسہرہ اور ہولی کے ساتھ ساتھ بسنت جیسے تہوار بھی اکٹھے مل کر منائے جاتے اور ایک دوسرے کے گھر مٹھائی اور دوسرے لوازمات بھجوائے جاتے۔ اُس زمانے کے لوگوں کی عکاسی مستنصر حسین تارڑ کے ناول کا یہ اقتباس بخوبی کرتا ہے۔

> "اسے اِس دریا کے --- جو کہ رواں تھا پار جانا تھا --- کہ وہ --- اُس نیم شکستہ پُل پر چلتا تھا جو اُس دریا پر قائم تھا اور اُسی پل پر سے گذرنے والا وہ تنہا نہ تھا، بیل گاڑی، ریہڑے، تانگے اور کچھ گھڑ سوار اور اُن کے گھوڑے بہت ناتواں لگتے تھے، وہ بھی گذر رہے تھے۔ یہ مخلوق جو لاہور شہر کی تھی لاہور یے کہلاتی تھی، اُس کے حساب سے بہت ناتواں جنس دکھائی دیتی تھی۔ اُن میں سے بیشتر تہمند میں نہیں مختصر دھوتیوں میں ملبوس تھے جن کے پلو اُن کی ٹانگوں میں سے گذر کر پشت پر بندھے ہوتے تھے --- اُن کے ماتھوں پر تلک کے سُرخ نشان تھے۔ تو یہ ہندو لوگ تھے۔ جو لاہور میں کثرت سے تھے --- اُس ہجوم میں چند ایک سکھ بھی نظر آئے --- اور اُس ہجوم میں جو

مسلمان دکھائی دیتے تھے وہ ان ہندوؤں اور سکھوں سے الگ بہت مسکین اور
ڈرے ڈرے دکھائی دے رہے تھے۔"(۱۱)

درج بالا اقتباس لاہور میں رہنے والوں تینوں مذاہب کے لوگوں کے لباس اور ظاہری حالت کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی معاشرتی اور معاشی حیثیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ آغاز سے لے کر آج تک لاہور کی زندگی ٹھہری نہیں بلکہ یہ شہر ہر لمحہ اور ہر عہد میں نئی تبدیلیاں سے آشنا ہوتا رہا اور ہر آنے والی تبدیلی تہذیب و ثقافت میں بھی تبدیلی لاتی چلی گئی۔ آج جو لاہور دُور دور تک آبادی کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا منظر پیش کرتا ہے کسی زمانے میں باغوں کا شہر تھا شہر لاہور کی شناخت اس کا سرکلر گارڈن اور اس میں رواں نہر تھی۔ جہاں اکھاڑے تھے، یار باشی کی محفلیں تھیں، ایک دوسرے کی خوشیاں اور غم بانٹے جاتے، مُرغ بازی ہوتی اور شہر کے تمام سماجی اور سیاسی اُتار چڑھاؤ بیان ہوتے۔ اِسی کی عکاسی مستنصر حسین تارڑ نے کچھ اس طرح کی ہے:

"شہر کی پرانی فصیل کے سائے میں باغوں کا جو سلسلہ اُس کی قدامت کو گھیرتا تھا وہاں سر شام لاہورئیے اپنی تنگ اور تاریک کبوتروں کے کابکوں ایسی کوٹھڑیوں میں سے نکل کر محفلیں آن جماتے ۔۔۔ پہلوان لوگ اپنے پٹھوں سمیت ورزشیں کرتے ۔۔۔ خواتین ان باغوں کے بیچ میں رواں چھوٹی سی نہر میں کپڑے دھوتیں اور بچوں کو نہلاتیں ۔۔۔ شطرنج کی بساطیں بچھ جاتیں ۔۔۔ نشئی حضرات اپنے نشے پورے کرتے کہ لاہورئیے افیون، چرس اور گانجے کے خاصے شوقین تھے۔"(۱۲)

لاہور میں مغلیہ طرزِ تعمیر میں باغ ایک لازمی جزو تھا۔ شالامار باغ ہو یا مقبرۂ جہانگیر یا بادشاہی مسجد یا پھر چوبرجی کی عمارت اور پھر شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ باغات کا سلسلہ لاہور کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتا تھا۔ انگریزوں کی آمد نے بھی لاہور کو باغوں سے سجائے رکھا۔ ان میں سب سے خوبصورت اور وسیع باغ جو شہر کے وسط میں تعمیر ہوا وہ باغ جناح ہے جسے پہلے لارنس گارڈن کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ باغ

۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء کے درمیان لگایا گیا اور وائسرائے جان لارنس کے نام سے منسوب ہوا۔ اِس کی قدامت اور گھنے درختوں کے باعث مستنصر حسین تارڑ اِسے ''جادو نگری'' کہتے ہیں۔ بانو قدسیہ کا شہرۂ آفاق ناول ''راجہ گدھ'' کی کہانی میں باغ جناح مرکزی مقام کے طور پر شامل ہے اور باغ جناح لاہور کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں اہم مقام ہے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

> ''باغ میں بہت رونق تھی، منٹگمری ہال پر شام کی آخری روشنی پڑ رہی تھی۔ بار بار کہیں سے پاپڑ بیچنے والے کی آواز باغ کی خاموشی پر گرتی۔۔۔ جب مرد کسی عورت سے بند کمرے میں مل نہیں سکتا یا ملنا نہیں چاہتا تو پھر وہ باغوں کا رُخ کرتا ہے۔۔۔ اِسی لیے باغوں کی خوشبو میں ایک سحر ہوتا ہے۔۔۔ لوگ شاید اپنے گم شدہ وجود، اپنی سائیکی، آزادی اور جبلی آرزوؤں کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ کیونکہ آج خلاف معمول سڑکوں پر بہت ہجوم تھا۔۔۔ باغوں کی سائیکی بہت اُداس ہوتی ہے۔ رُکے ہوئے آنسو، بند خیالات، جمی ہوئی آہیں۔۔۔ قدرسی اداسی پولن کی طرح جھڑتی ہے۔ اسی لیے کسی عہد، کسی قوم، کسی شہر کی سائیکی سمجھنے کے لیے اس کے باغوں میں بیٹھنا بہت ضروری ہے۔''(۱۳)

شہر لاہور کی خوبصورتی اور حسن کا باعث جہاں باغات اور ہریاول ہے وہاں اس کی کچھ سڑکیں اور عمارتیں بھی اس کی تہذیب و ثقافت کی امین ہیں۔ ان میں سب سے اہم شاہراہ مال روڈ ہے جسے ٹھنڈی سڑک بھی کہا جاتا تھا اور اب اِسے شاہراہ قائداعظم کا سرکاری نام عطا کر دیا گیا ہے۔ باغ جناح کی طرح مال روڈ بھی افسانوں، ناولوں، آپ بیتیوں اور کالموں میں شامل رہی۔ مال روڈ پر بنی عمارتیں لاہور کی تہذیب و ثقافت کی اہم جگہیں ہیں۔ اِس کے دونوں جانب تعمیر عظیم اور قدیم عمارتیں لاہوری تہذیب کو نمایاں کرتی ہیں۔ ۳مارچ ۱۸۵۱ء کو پیش ہونے والا یہ منصوبہ ایک ماہ کے اندر منظور ہو کر ایک سال کے اندر اندر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کا ذکر مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول میں کچھ اِس طرح سے کرتے ہیں:

”جیپ ایچی سن کالج کے پُل سے مال روڈ پر آ گئی اور سستی سے بمشکل۔۔۔
حرکت کرتے ہوئے ٹریفک کے اژدھے کا ایک حصہ بن گئی۔۔۔ بائیں ہاتھ پر
پرل کانٹی نینٹل کی ستھری اور دیدہ زیب عمارت تھی۔۔۔ بائیں جانب باغ
جناح کے جھنڈ اور سبز علاقے تھے۔۔۔ آج یہاں بہت لوگ تھے۔۔۔ اُس
سے آگے چڑیا گھر کے بڑے دروازے کے آس پاس اور بھڑکیلے لباسوں میں
، غبارے ہاتھ میں، تیز میک اپ جو سیاہ چہروں پر چمکتا تھا۔ آج اُن کی بھی
ہیپی کرسمس تھی۔۔۔ ”نیں میری کرسمس ٹویو“۔ ”سیم ٹویو نیں“۔ برگیتا
نے مشاہد کی جانب دیکھا وہ سامنے چیئرنگ کراس کے چوک کی طرف دیکھتا
جیپ چلا رہا تھا۔ ریگل چوک کے قریب ٹریفک بالکل جامد ہو چکی تھی۔“
(۱۴)

کسی بھی شہر کی تہذیب و ثقافت میں عمارات، سڑکیں تو اہم ہوتی ہی ہیں، اِس کے بازار بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ یہ جگہیں وہاں رہنے والوں کی سوچ اور سرگرمیوں کا مرکز ہوتے ہیں۔ مال روڈ کی طرح انارکلی بازار بھی اپنے آغاز سے لے کر آج تک لاہور کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی پہچان ہے۔ انارکلی صرف لاہور کا بازار نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت پورے پنجاب کے بازار کی تھی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم نسلوں تک انارکلی آتے رہے اور اُن کی یہ عادت آج بھی جاری ہے۔ ویسے تو لاہور شہر میں اندرون اور بیرون درجنوں بازار ہیں لیکن مغلیہ دور کی کنیز انارکلی کے نام پر تعمیر ہونے والا یہ بازار نہ صرف معروف ہے بلکہ رومانوی بھی ہے۔ انارکلی بازار میں سامان سے بھری دُکانیں جہاں خریداروں کو دعوت نظارہ دیتی ہیں وہیں دُکانداروں کے لیے بھی فخر کا باعث ٹھہرتی ہیں۔ اشرافیہ کسی زمانے میں دُکانوں کے اندر جا کر خریداری کرنا کسرِ شانِ خیال کرتے اور دُکان دار اپنا مال باہر لا کر اُنھیں دکھاتے۔ اِس کی عکاسی مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول میں کچھ اِس طرح کرتے ہیں۔

”جو معتبر اور حیثیت والے تھے وہ دُکانوں کے اندر جا کر خریداری کرنا اپنی
ہتک سمجھتے تھے۔ اُن کی بگھیاں باہر رُکتی تھیں اور دُکاندار لپکتے ہوئے آ کر اُن

کے پاؤں میں بچھے جاتے تھے۔۔۔وہ ان بگھیوں میں پاؤں پسارے براجمان
ہندنیوں اور سردارنیوں کے پاؤں کا ناپ ایک کاغذ پر اُتارتے اور پھر بھاگم
بھاگ دُکان کے اندر جا کر گُر گابیوں اور سینڈلوں کے درجنوں ڈبے اپنے
ملازموں کے کاندھوں پر رکھوائے چاپلوسی کی مسکراہٹیں بکھیرتے واپس
آتے اور اُن کے قدموں میں رکھ دیتے۔"(۱۵)

برصغیر کی تقسیم ہوئی۔ ہجرت نے مشترکہ تہذیبی ورثے کو بھی تقسیم کر دیا اور یہاں طبقاتی فرق بہت زیادہ بڑھ گیا۔ آبائی علاقوں کے رئیس اپنی جائیدادیں چھوڑ کر یہاں آئے تو حالات کی سنگینی کا شکار ہو گئے اور کچھ لوگ جعلی اثاثوں کی رسیدیں دکھا کر الاٹمنٹس کروا کر امیر اور اشرافیہ بن بیٹھے۔ لاہور میں بھی ایک ایسا طبقہ معاشرتی سطح پر ابھرا جو جعلی الاٹمنٹوں کے باعث مال دار تو بن گیا لیکن معاشرتی اقدار، روایتی وضع داری اور تہذیب و ثقافت سے آشنا نہ تھا بلکہ ان کی پیروی میں کچھ ایسے لوگ بھی ان اقدار کو نظر انداز کرنے لگ گئے جو کبھی ان سے آشنا تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی کے بعد ایسے ہی لوگوں نے اس خلا کو پُر کیا اور اس کا اثر لاہور کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار پر بھی پڑا اس کی عکاسی خالدہ حسین اپنے ناول میں کرتی ہیں:

"لاہور جاگیردارانہ ماحول میں گھرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ یہاں کے قدیم لوگ تھے
جو پنجاب کے مختلف گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنے بیٹوں کو یورپ،
برطانیہ اور بیٹیوں کو انگریزی اداروں میں تعلیم دلواتے تھے۔ جو باہر نہ جاتے
وہ اکثر لاہور کے چیفس کالج اور کلیات میں داخلہ لیتے۔ جہاں ان کی رگ
رگ میں تحکم اور دولت پرستی بھر دی جاتی۔"(۱۶)

لاہور کی زندگی اور اس سے جڑی تہذیب و ثقافت یہاں سے نقل مکانی کرنے کے بعد بھی لوگوں کے لیے کشش کا باعث رہی۔ مال روڈ، چڑیا گیا، لارنس گارڈن، نیلا گنبد، انارکلی اور کافی ہاؤس اُن کے ذہنوں میں ہمیشہ زندہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیساکھی کے میلے یا رنجیت سنگھ کی مڑھی یا پھر گورونانک کے جنم دن پر

جب بھی سکھوں کے جھتے لاہور آتے وہ سب سے پہلے انھی جگہوں کی سیر کرتے۔ خاص طور پر مال روڈ اور انارکلی کیونکہ لاہور میں مختلف نئے بازاروں کا چکا چوند وجود ہونے کے باوجود انارکلی اور اُس سے جڑی تہذیب و ثقافت آج بھی اُن کے دِلوں پر راج کرتی ہے۔ جیسا کہ یونس جاوید اپنے ناول میں لکھتے ہیں:

> ”سکھ جھتے جب بھی لاہور آتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر ایک ہی تصویر نقش ہوتی ہے جس میں مال روڈ یا ٹھنڈی سڑک، نیلا گنبد اور سب سے گہرے نقوش والی انارکلی اور اس کے اندر کی گلیاں۔۔۔شاید ایک سبب اس کا یہ بھی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بٹوارے کے وقت لاہور اِس قدر پھیلاؤ میں تھا ہی نہیں جو اُن کی یادوں میں محفوظ ہوتا۔ لے دے کے مال روڈ، چڑیا گھر، لارنس گارڈن، نیلا گنبد اور سب سے بڑھ کر مرکز نگاہ انارکلی تھی کہ سرِ شام ہر کوئی اس مغل دربار میں حاضری دینے کو زندگی کا حسن سمجھتا تھا۔ سارا لاہور اور اُس کا حسن سمٹ کر اس ایک ہمہماتے بازار میں جمع ہو جاتا اور خریداروں کی بھیڑ بڑھنے لگتی۔۔۔ سیر کی سیر۔۔۔ شاپنگ کی شاپنگ اور تفریحی مناظر الگ۔“(۱۷)

مجموعی طور پر اُردو ناول کے تاروپود تہذیب اور ثقافت کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں اور برصغیر پاک و ہند میں لکھے گئے کئی سرکردہ ناول لاہور کی تہذیب و ثقافت کو بیان کرتے ہیں۔ اور کئی اُردو ناول تو لکھے ہی لاہوری زندگی کے تناظر میں ہیں۔ مثلاً بانو قدسیہ کا ”راجہ گدھ“ عاصم بٹ کے ناول ”بھید“ اور ”دائرہ“ وغیرہ۔ لاہور جو صدیوں تک ہندوستان کا تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی مرکز رہا ہے اور پنجاب کی ثقافتی زندگی کے تمام رنگ بھی اِسی شہر سے پھوٹتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ناول کے حوالہ سے منظرِ عام پر آنے والی اکثر تحریریں لاہوری تہذیب و ثقافت کو سمیٹتی نظر آتی ہیں اور ان ناولوں کو پڑھتے ہوئے لاہور اپنی تمام تر رعنائیوں اور رونقوں کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

1- Fox Ralph. The Novel and The People. New York: International Publishers, 1945, P51

۲۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ:۱۹۸۷ء، ص۳۷

۳۔ ایضاً، ص۳۹

۴۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص۹

۵۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی: شہر زار، ۲۰۱۱ء، ص۸۹

۶۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص۳۸

۷۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی: شہر زار، ۲۰۱۱ء، ص۱۰۰

۸۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص۲۶

۹۔ مستنصر حسین تارڑ، اے غزل شب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص۱۶۰

۱۰۔ اے حمید، پھول گرتے ہیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص۵۱

۱۱۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، صفحہ ۱۲۴

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۵

۱۳۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۱۳۵

۱۴۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص۲۵۔۲۶

۱۵۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، صفحہ ۲۴۳

۱۶۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۶۸

۱۷۔ یونس جاوید، ستونت سنگھ کا کالا دِن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص۱۱